آزاد

انتخاب کلامِ جگن ناتھ آزاد

انجمن ترقّی اُردو (ہند) علی گڑھ

(دِلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

قیمت پچھتّر نئے پیسے

طباعت

ترتیب

غزل

نظم

نسیم شعلہ بنی اور شاخِ گل تلوار　　کچھ اس طرح سے گلستاں میں آئی فصلِ بہار

سکوں ملا جو نظر کو تو دل تڑپ اٹھا　　دل و نظر کو بہم مل سکا کبھی نہ قرار

خزاں کو صحنِ چمن سے گئے زمانہ ہوا　　ابھی فضائے گلستاں میں اڑ رہا ہے غبار

مقامِ وعظ کہاں اور مقامِ راز کہاں

مقامِ وعظ ہے منبر مقامِ راز ہے دار

جہاں آزادیٔ قلبِ ناتواں سے کچھ نہیں ہوتا
وہاں اندیشۂ سود و زیاں سے کچھ نہیں ہوتا

یہاں اکثر خموشی رازِ پنہاں کھول دیتی ہے
حضورِ دوست طولِ داستاں سے کچھ نہیں ہوتا

ذرا سا بھی یقیں دنیائے فانی میں بڑی شے ہے
گماں کتنا ہی بڑھ جائے گماں سے کچھ نہیں ہوتا

سخن کے باغ کی تو خونِ دل سے آبیاری کر
جو یہ کر لے تو پھر بادِ خزاں سے کچھ نہیں ہوتا

غزل سوزِ دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے
فقط رنگینیٔ حسنِ بیاں سے کچھ نہیں ہوتا

یہاں اے زندگی خونِ جگر کچھ رنگ لاتا ہے
محبّت میں فقط آہ و فغاں سے کچھ نہیں ہوتا
اگر ہو آستاں سے ربطِ دل تب بات بنتی ہے
فقط ربطِ جبین و آستاں سے کچھ نہیں ہوتا

کہاں ہو کارواں والو کہاں ہو　　تلاشِ کارواں ہے اور میں ہوں
ذرا آواز دے اے دورِ ماضی　　ترا دردِ نہاں ہے اور میں ہوں
نظر پھر دشمنوں کو ڈھونڈتی ہے
جفائے دوستاں ہے اور میں ہوں

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو تو اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُن کی
جنونِ سر فروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشم عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھو آزادؔ اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

اگست ۱۹۴۷ء

غمِ دوراں غمِ جاناں کا بدل ہی کہ نہیں
اس میں بھی تاب و تبِ سوزِ ازل ہی کہ نہیں
محفلِ شعر میں کل تک جو رہی ہے ممنوع
آج اُس تلخ کلامی کا محل ہی کہ نہیں
جو حدودِ غمِ جاناں سے پرے جا نہ سکے
آج اس ذہن میں ای دوست! خلل ہی کہ نہیں
علمِ افکار زمانے میں بڑا علم سہی
علم ہر دور میں محتاجِ عمل ہی کہ نہیں

جس نے اس دور میں مجبور کا خوں گرمایا

وہ ہُنر مسئلہ دہر کا حل ہے کہ نہیں

اُڑ سکے عرش پہ جو خاک پہ جو چل نہ سکے

آج اُس فکر میں تقصیر و کسل ہے کہ نہیں

موت اور اُس کے عواقب سے ڈرانیوالے!

موت کی طرح غم زیست اٹل ہے کہ نہیں

جس کو تو زہر سمجھتا ہے ادب کے حق میں

وہ مرے شعر میں تریاق و عسل ہے کہ نہیں

اے غزل کو غم محبوب سمجھنے والے!

یہ جواب میں نے سنائی ہے غزل ہے کہ نہیں

مری نگاہ کو سجدے کا حوصلہ ہی نہ تھا
اگرچہ میں بھی ترے آستاں سے گزرا ہوں

کہیں مذاقِ نظر کو قرار مل نہ سکا
کبھی چمن سے کبھی کہکشاں سے گزرا ہوں

ترے قریب سے گزرا ہوں اس طرح کہ مجھے
خبر بھی نہ ہو سکی میں کہاں سے گزرا ہوں

دیارِ دوست سے گزرا تو ہوں مگر آزادؔ
عجیب بے خبری میں وہاں سے گزرا ہوں

یہ رنگِ نغمۂ دلکش زباں کچھ اور کہتی ہے
باندازِ سکوت اپنی فغاں کچھ اور کہتی ہے

مرے دل سے بہارِ گلستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر آزاد! یادِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

تمہاری برق رفتاری بجا اے قافلے والو!
مگر رفتارِ میرِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

فغاں کہتی ہے بس ہر دردِ پنہاں کا مداوا ہوں
ولیکن کاوشِ ضبطِ فغاں کچھ اور کہتی ہے

تبایا جا رہا ہی قافلہ منزل پہ آپہنچا
مگر اس قافلے کی داستاں کچھ اور کہتی ہے
غضب ہی نغمہ ہائے سارباں کچھ اور کہتی ہیں
مگر بانگِ درائے کارواں کچھ اور کہتی ہے
ادب میں اک جمود آیا ہوا ہی لوگ کہتے ہیں
مگر آزادؔ کی طرزِ بیاں کچھ اور کہتی ہے

کبھی بلندیٔ ذوقِ نظر تک آ پہنچی
کبھی حیاتِ غمِ بال و پر تک آ پہنچی

فغاں کے مل کے بھی ہم تم اسے نہ روک سکے
شبِ وصال حدودِ سحر تک آ پہنچی

نظر سے بڑھ کے زباں تک کہیں نہ آ جائے
جہانِ دل کی کہانی نظر تک آ پہنچی

ابھی تو دل میں ہی خوابیدہ حسرتِ پرواز
یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آ پہنچی

نظر کی بات تو کچھ اور ہے مگر کیونکر
تری شبیہہ دلِ بے خبر تک آ پہنچی

بھٹک رہی ہے ابھی تک تو آرزو دل کی
اگر کبھی یہ تری رہگذر تک آ پہنچی

جو دل کا راز ہے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے

تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی

کبھی صیّاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ دُنیا ہی یہاں ہر کام چلتا ہے سلیقے سے

یہاں پتھر کو بھی لعلِ گراں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں

کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

مروّت کی قسم تیری خوشی کے واسطے اکثر
سرابِ دشت کو آبِ رواں کہنا ہی پڑتا ہی
بھرے بازار میں جب کوئی بھی گاہک نہیں ملتا
تو پھر ہیرے کو جنسِ رائیگاں کہنا ہی پڑتا ہی
زبانوں پر دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہی
نہ پوچھو کیا گزرتی ہی دلِ خوددار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہی

:::

رباعیات

"افسانۂ آں شبے"

پہلا رُخ

وہ رات کہ جب خُلدِ بریں تھا پہلو
جب درج ہوا تھی درج مۓ وفت سبُو

وہ رات تصوّر میں بسی ہے ایسے
جس طرح شراب میں نشہ پھُول میں بو

چہرے پہ وہ سیلابِ تبسّم ہی ہی
سینے میں وہ اک جوشِ تلاطم ہی ہی
کانوں میں مرے گونج رہا ہی اینک
وہ رات کا خاموش ترنّم ہی ہی

انسان کے حالات ہیں کس کے بس میں
اُڑتے ہوئے لمحات ہیں کس کے بس میں
اک رات ملی تھی اتفاقاً ورنہ
دنیا ترے دن رات ہیں کس کے بس میں

گردوں پہ گھٹا تلی تھی گھنگھور اے دوست
رہوار ہواؤں کے تھے منہ زور ای دوست
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں کہیں
ہم تم تھے پسینے میں شرابور ای دوست

کل شب کہ فضا تھی مست بے جامِ وسُبو
تھا ہوش کی قید میں نہیں اور نہ تو
اُڑ اُڑ کے حریم روح تک جاتی تھی
وہ تیرے بدن کی بھینی بھینی خوشبو

وہ کاکلِ دل نواز مہکی مہکی

ہر بات کلی کی طرح لہکی لہکی

ہنگام سحر بھی دل میں ہے رقص کناں

اے دوست تری نظر وہ بہکی بہکی

دوسرا رُخ

ہاں محوِ سفر زمیں ہے جاگو جاگو

پھر وقتِ سحر قریں ہے جاگو جاگو

آنکھوں کو ملو، نظر اٹھاؤ کہ یہ رات

سونے کے لئے نہیں ہے جاگو جاگو

امکان ملاقات کے پھر کم ہوں گے
سِمٹے ہوئے لمحات یہ برہم ہونگے
جب صبح اُفق پہ جلوہ فرما ہوگی
کیا علم، کہاں تم، اور کہاں ہم ہونگے

اس سی پہلے کہ صبح پھوٹے اي دوست!
بجلی کی طرح وہ ہم پہ ٹوٹے اي دوست!
اُڑتے ہوئے لمحات کو یُوں اپنالیں
اک لمحہ بھی ہاتھوں سی نہ چُھوٹے اي دوست!

بزم طرب و نشاط، برہم نہ کرو
یہ محفل انبساط، برہم نہ کرو
اے صبح کی زرنگار کرنو! رُک جاؤ
خود جم کے مری بساط برہم نہ کرو

ساعت ہی فراق کی پھر آنے والی
ہے کوئی گھڑی ہیں رات جانیوالی
لمحے یہ گراں بہا ہیں اے دوست کہ پھر
ہے صبح اُفق پہ جگمگانے والی

اب رات کے خاتمے کا ہے وقت قلیل
ہونے کو ہے یہ سماں سحر میں تبدیل
جی بھر کے اُنہیں دیکھ کہ بُجھ جائے گی
اس بزمِ طرب کی خود بخود ہر قندیل

ذوقِ نظر اک مقام پر رہ نہ سکے
جلووں کا یہ طوفان کہ دل سہہ نہ سکے
زورِ نطق اگر بیان کرنا چاہے
اس وقت کی کیفیت کبھی کہہ نہ سکے

یہ خنکیٔ ماہتاب میں دل کی جلن
سینے کی یہ خامشیٔ شب میں دھڑکن
یہ نیند کے وقت گفتگو سانسوں میں
بیلے سے یہ اک مکاں میں خوشبوئے بدن

فردوس کا باب ہی یہ رات اے ساقی!
اُڑتا ہوا خواب ہے یہ رات اے ساقی!
اس رات کو لمحات کا پیکر نہ سمجھ
پی لے کہ شراب ہی یہ رات اے ساقی!

فریاد کہ رات ہاتھ میں آ کے گئی

اک لُطفِ عظیم ہم پہ فرما کے گئی

ماحول کی تیرگی میں فیّاضانہ

فریاد کہ رات نور برسا کے گئی

اے مہر! کبھی تیرا اشارہ نہ ملے

اے نور! کبھی تیرا سہارا نہ ملے

میں رات کے طوفان میں بھٹکتا ہی رہوں

اے صبح! کبھی تیرا کنارا نہ ملے

تیسرا رُخ

آخری سحر آکے دل کو تڑپا ہی گئی
یہ تیرگی آکے نور پہ چھا ہی گئی
ضو ریز جو دل میں تھیں امنگیں آزاد
کالا کفن ان کو آکے پہنا ہی گئی

رات اپنا جمال کھو رہی ہی سو جاؤ
چہرہ شبنم سے دھو رہی ہی سو جاؤ
ٹوٹے ہوئے جسم پر ذرا رحم کرو
اب صبح طلوع ہو رہی ہی سو جاؤ

آخری رُخ

جو نیند میں ہو، نیند میں رہ جاتا ہے
بیدار سے رازِ زیست کہہ جاتا ہے
اک نور کا دریا کہ سحر سے پہلے
ظلمات کی وادیوں میں بہہ جاتا ہے

اک رات اگر کرم پہ مائل ہو جائے
انساں کے ہر نفس میں شامل ہو جائے
یہ رات۔ یہ شام سے سحر تک کا سماں
پھیلے تو زندگی کا حاصل ہو جائے

پھولوں کی طرح نفس مہک جاتے ہیں
شاخوں کی طرح بدن لچک جاتے ہیں
مل جاتے ہیں بھٹکے ہوئے دو دل جو کہیں
اس رات کی ظلمت میں چمک جاتے ہیں

نمودِ فن

طویل نظم "اجنتا کے غاروں میں" کا ایک ٹکڑا

شاعِر

اے بُتِ سنگیں دل و سنگیں رُخ و سنگیں بدن
جس کا تو اک پھول ہی آخر کہاں ہی وہ چمن
کونسی دُنیا کا آدم ہے تو کس دریا کی موج
کس سمندر کا صدف ہی کس تخیل کا ہی اوج

وقت کے پتھر پہ تیرا نقش ہی نقشِ دوام

السّلام اے ہند کے اوجِ تخیل السّلام

یہ بتا آنے سے پہلے عالمِ اسرار میں

تو دلِ کہسار میں تھا یا دلِ فنکار میں

بُت کا جواب

میں کبھی فنکار کے سینے میں تھا محوِ خروش

جس طرح افکار تیرے دل میں ہیں طوفاں بدوش

عالمِ افکار کو کاغذ پہ لے آتا ہے تُو

مجھ کو اس عالم میں لے آیا مرا ذوقِ نمو

جب دلِ فنکار میں میری تڑپ بڑھنے لگی
میرے ارمانوں کی ندّی زور سے چڑھنے لگی
تیشۂ فن کار نے سنگِ گراں کا رُخ کیا
فکرِ آدم نے حیاتِ جاوداں کا رُخ کیا
ضرب کاری تیشۂ فنکار کی کہسار پر
چھا گئیں گویا بہاریں دامنِ گلزار پر
دیکھ مجھ کو سینۂ کہسار کا عالم نہ پوچھ
اے مسافر! ضربتِ فنکار کا عالم نہ پوچھ

ندائے غیب

اے نئے دور کے نئے فن کار
اس قدر حیرتی نہ ہو زنہار

یہ جو دیکھا ہے تُو نے ایک مقام
ایک تصویرِ گردشِ ایّام

نقشِ پا کاروانِ زیست کا ہے
ایک ذرّہ جہانِ زیست کا ہے

اس زمین و زماں کے سینے میں
وقت کے بے اماں دفینے ہیں

ایسے ہیروں کا کچھ شمار نہیں
کچھ مگر اُن کا اعتبار نہیں

کاروانِ وقت کا جو چلتا ہے
عرش و کرسی کا دل دہلتا ہے

وہ اجنتا ہو، یا ابلورا ہو
یا تماشائے گولکنڈا ہو

قطب صاحب کا وہ منارا ہو
لال قلعے کا یا نظارا ہو

گوربی ہو یا ہو تاج محل
ٹیکشلا کے وہ یا ہوں راج محل

وقت کے کارواں کے رستے پر
میل و فرسنگ کے یہ ہیں پتھر

اِن سے گذرا ہی کاروانِ حیات
یہ ہیں سب جزوِ داستانِ حیات

منزلیں ارتقا کی ہیں یہ تمام
عقل کے آخری نہیں یہ مقام

ذہن انسان کا آفتاب عظیم
جس سے ہے آدمی عقیل و فہیم

یہ اُسی کی ضیا کے دھارے ہیں
فلک ارتقا کے تارے ہیں

اُن کے جلووں میں گھر کے رہ جانا
اُن کے طوفاں کی رَو میں بہہ جانا

زیب دیتا نہیں تجھے زنہار
اے نئے دور کے نئے فن کار

ان سے لے کر ابھار جذبے کا
تو بڑھا لے نکھار جذبے کا

نغمۂ تازہ تر سُنا اپنا
سوئے فردا قدم بڑھا اپنا

یہ ہے ماضی تو یہ ہی مستقبل
اس جھمیلے سے کچھ نہیں حاصل

زندگی ایک، کائنات ہی ایک
یہ تماشائے شش جہات ہی ایک

یہ نیا اور یہ پُرانا ہے
لغو اور بیہودہ فسانا ہے

شعر ہی کی مثال دیکھ ذرا
اپنی دنیا کا حال دیکھ ذرا

شعر کے بے خزاں گلستاں میں
اس حسیں عالم بہاراں میں

پھُول حالیؔ اگر نہ چُن سکتا
شعر اقبالؔ کون سُن سکتا

کون بزم وطن کو گرماتا
نغمۂ جوشؔ کون سُن پاتا

پھر نئی زندگی کہاں ہوتی ؟
آج کی شاعری کہاں ہوتی ؟

اے اجنتا کے دیکھنے والے	کہنہ دنیا کو دیکھنے والے
یہی تصویر آج سے ہو کر	جگمگائے گی کل کے پردے پر
اس میں پھر اک ضیائے نو ہوگی	اک عجیب تابناک ضو ہوگی
رنگ یہ حسن گھڑی جمائے گی	زیست کی بزم جگمگائے گی
یہ کبھی شعر کو دمک دیگی	کبھی تاریخ کو چمک دیگی
یہ بھی لیکن بتاؤں کیا ہوگا	یہ بھی اک سنگِ میل سا ہوگا
زندگی اس سے روشنی لے کر	بہ تسلسل رہے گی گرم سفر
رک سکے گا نہ کاروانِ حیات	کہ ہے ذوق سفر نشانِ حیات

دہلی کی جامع مسجد

اے جذبِ طہارت کی امیں مسجدِ جامع
روشن دل و تابندہ جبیں مسجدِ جامع

اے جلوۂ انوارِ یقیں مسجدِ جامع
اے خاتمِ دہلی کی نگیں مسجدِ جامع

ہے آج بھی تسکینِ نظر تیرا نظارا
تو آج بھی ہر روح کی دنیا کا سہارا

دامن میں سنبھالے ہوئے صدیوں کی امانت
پاکیزگی قلب و نظر روح کی عفت

شاہی میں فقیری کی درخشندہ روایت
احساس کا اک جذبۂ سرشارِ حقیقت

اس دور میں تو منبعِ انوار ہے اب بھی
تاریکیٔ عالم میں ضیا بار ہے اب بھی

اک نقشِ دلآویز ہے تو خونِ جگر کا　　جلوہ ترا نظارہ ہے انوارِ سحر کا

تو فن کی ہی تصویر، نمونہ ہی ہنر کا　　شہپارۂ جاوید ہی تو ذوقِ نظر کا

رقصاں تری دنیا میں ہیں آیاتِ تجلّی

اللہ رے تیرے یہ مقاماتِ تجلّی

تو فقر کی تصویر ہی وہ زیرِ سماوات　　ہیں جس سے عیاں سینۂ آدم کی کمالات

دنیا کو دکھا آج کوئی حسنِ کرامات　　تو چشمۂ حیواں ہی جہانِ عالمِ ظلمات

تو آج ہے اک سوزِ محبّت کا نمونہ

اے آدمِ خاکی کی کرامت کا نمونہ

ہر خشت میں آباد ہی اذکار کی دنیا　　ہر سنگ میں ہی جذبۂ بیدار کی دنیا

ہر نقش میں خوابیدہ ہی اسرار کی دنیا　　تعمیر ہی تیری کہ ہے انوار کی دنیا

کیا تجھ سے کہوں کیا ہی تری اوجِ مقامی

تو عالمِ فانی میں ہی اک نقشِ دوامی

ے معبدِ اربابِ یقیں حاصلِ ادراک   اے منزلِ انوارِ کہن جلوہ گہِ پاک

ستیِ دوامی سے عبارت ہے تری خاک   کیا گردشِ ایام ہی کیا گردشِ افلاک

دنیا ہی تری نور فزا روزِ ابد تک

ہے ساز ترا نغمہ سرا روزِ ابد تک

ں دور میں کیا تجھ سے کروں ذکرِ زمانہ   اس نے تو بنایا ہی حقیقت کو فسانہ

تیر ہوا بے خبرِ رنگِ نشانہ   ہر نالۂ ماتم نظر آتا ہے ترانہ

ممکن ہو تو اس دور کے انداز بدل دے

انساں کا ذرا ذوقِ تگ و تاز بدل دے

اُردو

میری زباں پہ آج ہے اپنی زبان کی بات

ظاہر میں نغمہ ہے یہ، بباطن فغاں کی بات

کچھ غیر کی ہے کچھ ستمِ دوستاں کی بات

سوزِ دروں کی بات ہے دردِ نہاں کی بات

دل کے الم کی بات ہے، اُردو کا ذکر ہے

اپنے چمن کے پھول کی خوشبو کا ذکر ہے

یہ پھول وہ ہے جس کی پھبن سے سماں رہا
زیب کلاہ و زلف رہا، یہ جہاں رہا
کل تک جو بے نیازِ طلسم خزاں رہا
عز و وقار گلشن ہندوستاں رہا
آج اس میں تازگی وہ نہیں، وہ لہک نہیں
دل میں تڑپ ہے، چہرے پہ لیکن چمک نہیں
اے پھول میرے باغ سخن کے حری زباں
کل تک ترے تھے غالبؔ و اقبالؔ نغمہ خواں
محفل میں تیری آج خموشی کا ہے سماں
مجھ کو رلا رہی ہے لہو تیری داستاں

ڈرتا ہوں میں بساطِ محبت الٹ نہ جائے
سینوں میں ہے جو درد کی دنیا سمٹ نہ جائے

اے ذوقِ جستجو کی تمنائے خوب تر
کیسے گنے کوئی ترے احسان ہند پر

جب حرمتِ وطن پہ تھی انگریز کی نظر
اس وقت بھی رہی تو مقاصد سے باخبر

منزل کا اس سلیقے سے تو نے پتا دیا
رستے پہ حریت کے وطن کو لگا دیا

تو شاخِ گل، لچک میں، لطافت میں ہے شمیم
تیزی میں مثلِ باد، روانی میں تو نسیم

پاکیزگیٔ فکر و معانی کی اے حریم
خوبی تری زباں پہ نہیں، دل میں ہے مقیم

لطف بہارِ باغ و چمن باغباں سے پوچھ
کیفِ نشاطِ منزلِ دل، کارواں سے پوچھ

میری حیات ہے مری روحِ رواں ہے تو
مہر و وفا کی ایک حسیں داستاں ہے تو

ہر چند کشتۂ ستمِ آسماں ہے تو
پھر بھی شکست خوردہ نہیں کامراں ہے تو

میری زباں ہے نازشِ ہندوستاں ہے تو
بھارت کے لازوال تمدن کی جاں ہے تو

شیریں سخن ہے خوش گہر و ارجمند ہے

احساس کہہ رہا ہے کہ تو شہد و قند ہے

تیری ہر اک ادا مجھے دل سے پسند ہے

تجھ سے مرے وطن کا ادب سربلند ہے

باغ وطن میں مثل نسیم سحر ہے تو

راتوں کی ظلمتوں میں ضیائے قمر ہے تو

بازگشت

طویل نظم "وطن میں اجنبی" کا ایک جزو
پاکستان کے قرب وجوار میں پہنچکر

ای مری ارضِ وطن! ای ارضِ پاک! قلبِ عالم کی ضمیرِ تابناک!
ای وطن! ای خطۂ اربابِ ذوق زندگی تیری سراپا جذب و شوق
حق پرستوں کے فقیروں کی وطن! دہر کے روشن ضمیروں کے وطن!
نور کا جوہر ہے تیری خاک میں عشق رقصاں ہی تیری ادراک میں

تیرا ہر ذرہ ہے تاروں سی بلند
خاک تیری مثل اکسیر ارجمند

ای وطن! ای ہیر رانجھے کی زمین
سوہنی و مہینوال کی بزم حسین

ای محبت کے پرستاروں کے دیس
ای شجاعوں کے، جگر داروں کے دیس

دائمی ہی آج تیری آب و تاب
تجھ پہ چمکے ہیں ہزاروں آفتاب

فکرِ وارث شاہ کا مسکن ہی تو
قلب حق آگاہ کا مسکن ہی تو

تو ہی نانک کی نظر سے فیضیاب
قطب دوراں[۱] کے اثر سے فیضیاب

رام تیرتھ تجھ پہ نور افشاں رہا
اہر ہستی تھا، سرور افشاں رہا

ای وطن! تو ہی وہ پاکیزہ جہاں!
جس میں گونجا نعرۂ خوشحال خاں

---

[۱] اعلیٰ حضرت سید شیخ مخدوم علی ہجویری۔

اور وہ محرابِ گُل، مردِ سلیم　　جس کا دل تھا بے نیازِ یاس و بیم
شاعرِ رنگیں مزاج و پختہ کار　　جاودانی زندگی کا رازدار

وہ بہادر، وہ فقیرِ بے گلیم
تھا ترے ہی طور کا کلیم

ای وطن! ای مہر و الفت کے چمن　　میری دیرینہ محبت کے چمن!
تو امانت دارِ ماضی ہی مرا　　محرمِ اسرارِ ماضی ہی مرا
میں کہ تیرا ہی گلِ صد پارہ ہوں　　نکہتِ گل کی طرح آوارہ ہوں

دشتِ غربت میں وطن سی دُور ہُوں
پھُول ہوں اپنے چمن سے دُور ہُوں

ای وفا رسم و نشاط آئینِ چمن　　ای مرے بچھڑے ہوئے رنگیں چمن

آج پھر تیری طرف ہوں تیز گام
دیکھ ایک پابند کا ذوقِ خرام

دشتِ غربت چھوڑ کر آیا ہوں میں
صُورتِ بادِ سحر آیا ہوں میں

تو مجھے میری امانت سونپ دے

پھر مجھے اپنی محبت سونپ دے

چناب کے کنارے

سفر میں شام ہوئی ہے کنارِ رودِ چناب
تڑپ یہاں تو سنبھل کر تڑپ دلِ بیتاب

دیارِ عشق ہے یہ سرزمینِ درد ہے یہ
ہوا نہیں ہے فضاؤں کی آہِ سرد ہے یہ

یہاں گداز کا شعلہ بھڑک رہا ہے ابھی
ہر ایک ذرے کا سینہ دھڑک رہا ہے ابھی

جو سطحِ آبِ رواں پر نگاہ جاتی ہے
ہر ایک موج کوئی داستاں سناتی ہے

وہ ایک موج نے طوفاں کا روپ دھار لیا
جنوں نے اپنا سفینہ یہیں اُتار لیا

چلا ہے موج سے لڑتا ہوا سفینۂ عشق
سنبھل کے موجِ رواں یہ ہے سوہنی سفینۂ عشق

ترا تموجِ فانی نہ چل سکے گا یہاں
کوئی اصولِ زمانی نہ چل سکے گا یہاں

اُبھر نہ کف بہ دہن موج اِس طرح تن کر — چلی ہی رُوحِ محبت سفینہ راں بن کر

ابھی سفینہ یہ دریا کے پار اُترے گا — بھنور تو اپنے دکھائے ہزار اُترے گا

ترے خروش کو دردِ نہاں عطا کرے

رہے گا زندگی جاوداں عطا کرے

وہ اپنے ہاتھ میں کچا گھڑا اُٹھائے ہوئے — کسی کے شوقِ نظارہ سے دل لگائے ہوئے

اُتر گئی کہیں طوفاں میں رُوحِ دردِ گداز — بسی بھنور ہی میں دنیائے شانِ ناز و نیاز

اُدھر شباب پہ دریا اِدھر شباب پہ عشق — ہی آج ذوقِ فنا تیرے احتساب پہ عشق

بھنور کے سامنے کچے گھڑے کی تاب ہی کیا — مگر شکست جو مانے تو وہ شباب ہی کیا

گھڑے کی خاک کہاں اور بھنور کا جوش کہاں — بشر کی تاب کہاں موج کا خروش کہاں

معاً بھنور کی تہوں سے صدائے درد آئی — وفا نے آج ہمیشہ کی زندگی پائی

گداز دے گئی ایسا کچھ آگ پانی کو
نئی حیات ملی موج کی روانی کو

رواں چناب پہ اب بھی کئی سفینے ہیں — ہر ایک موج کے دل میں نہاں خزینے ہیں
ہر ایک موج پہ اب بھی رواں ہیں کچے گھڑے — نیازِ عشق تری آستاں ہیں کچے گھڑے
دلِ صبور یہاں آنسوؤں کا نذرانہ — کہ اس فضا میں ہے آبادِ بزمِ جانانہ
نگاہِ شوق! مناسب ہے احترام یہاں — چھلک رہا ہے مئے عاشقی کا جام یہاں
ادب تخیلِ شاعر وفا کی بزم ہے یہ — حیا کی بزم ہے صدق و صفا کی بزم ہے یہ

الگ زمانہ سے دنیائے آب و خاک ہے یہ
فروغِ دل کی تجلی سے تابناک ہے یہ

راولپنڈی سے دہلی آتے ہوئے
۵ر نومبر ۱۹۵۳ء

اے کشورِ ہندوستاں

اے کشورِ ہندوستاں　　اے خطۂ جنّت نشاں

اے سجدہ گاہِ قدسیاں

اے منبعِ انوارِ حق　　اے کعبۂ رُوحانیاں

اے قبلۂ عرفانیاں　　اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

تو ہے وقارِ علم وفن تو اعتبارِ علم وفن
سرمایہ دارِ علم وفن
گلزارِ ہست و بود میں تو ہے بہارِ علم وفن
اے علم وفن کے پاسباں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں
پایا ہے اے عالی گہر تو نے ریاضت کا ثمر
تجھ پر ہے عالم کی نظر
فسطائیت کی رات میں جمہوریت کے عرش پر
چمکا ہے تو مہتاب ساں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے منبعِ مہر و وفا　　اے مخزنِ صدق و صفا
اے مصدرِ نور و ضیاء

اس تیرہ باطن دور میں　　دہرائے جا دہرائے جا
مہر و وفا کی داستاں　　اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے مرجعِ ہر عز و شاں　　عالم ترا افسانہ خواں
دنیا تری رطب اللساں

افزوں ہو تیرا مرتبہ　　اے مرتبوں کے رازداں
شائستہ اوجِ بیاں　　اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ہیں تیرے نظّارے حسیں　　روشن دل و روشن جبیں

ذرّے ہیں تیرے عنبریں

تیری ہوائیں دل کشا　　تیری فضائیں دل نشیں

اے دل کشی کی داستاں　　اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

صبحِ بنارس کے بیاں　　شامِ اودھ کی داستاں

اے نور پاروں کے جہاں

دنیا کی تاریکی میں ہے　　تو روشنی کا کارواں

اے منزلِ نورانیاں　　اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

بنگال کی رعنائیاں　　پنجاب کی زیبائیاں

ہیں تیرے دامن میں رواں

افشاں جبیں پر ہے تری　　کشمیر کا باغِ جناں

رعنائیوں کی داستاں　　اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

بنگلور کی ہے سرزمیں　　یا خطۂ خُلدِ بریں

ذرّے جہاں کے دل نشیں

پانی شرابی ہے جہاں　　مٹّی جہاں ہے عنبریں

اے رنگ و نکہت کے جہاں　　اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

تیرے پہاڑوں میں نہاں دولت کے انبارِ گراں

اے خطۂ دولت رساں

تو قسمتِ بیدار ہے تو ہے نشاطِ جاوداں

تو ہے بہارِ بے خزاں اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے خطۂ گنگ و جمن اے عالمِ شعر و سخن

کیا شے ہے تیرا بانکپن

تو فلسفے کا دیس ہے تو شاعری کا ہے وطن

شعر و ادب کے آسماں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے عالمِ دنیا و دیں   اے سرِّ قفلِ آہنیں

اے چہرۂ حسنِ یقیں

ہے تیری خاکِ پاک کا   ہر ذرّہ حکمت آفریں

ہر حقیقت کے جہاں   اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

ویدِ مقدس کی زمیں   تقدیسِ عالم کی امیں

روشن دل و تاباں جبیں

برسے ترے ماحول پر   تُلسی کے نغماتِ حسیں

تقدیس کے اے رازداں   اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

تو کرشن کا گہوارہ ہے   تقدیس کا شہ پارہ ہے

تنویر کا نظارہ ہے

تو آسمانِ قدس کا   روشن ترین ستارہ ہے

تقدیس کے اے آسماں   اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

گوتم کے اے آرامِ جاں   نانک کی بانی کے جہاں

فکر و نظر کے آستاں

اجمیر کی درگاہ سے   تیری زمیں ہے آسماں

ذرے ہیں تیرے کہکشاں   اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

صابرؒ یہیں عنبر چکاں   کاکیؒ یہیں گوہر فشاں

جن سے زمیں ہے آسماں

گورِ نظام الدّیںؒ کے ہیں   ذرّے حریفِ کہکشاں

رُوحانیت کے رازداں   اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے سرزمینِ علم و فن   فخرِ جہاں فخرِ زمن

اے میر و غالب کے وطن

مہکا ترے ماحول میں   رنگیں تخیّل کا چمن

رنگین تخیّل کے جہاں   اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اے خطۂ روشن جبیں حالی ترے گھر کا مکیں
مہماں ترا ابنِ یمیں
تو بھارتی کا ہے وطن تو ہے مسرت کی سرزمیں
اے سرزمینِ گل فشاں اُونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ایران سے آیا یہاں علم و ہنر کا کارواں
شعر و سخن کا رازداں
چمکا گیا تیری فضا دمکا گیا تیرا جہاں
اے اہلِ دل کے آستاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

وہ عرفیٔ شیریں زباں　　وہ فیضیٔ جادو بیاں

وہ مشہدیٔ نکتہ داں

سرمد، کلیم و آملی　　سب شاعرانِ دُر فشاں

تیرے ہیں گنجِ شائیگاں　　اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اللہ رے تیری آستیں　　ہیرے کہیں موتی کہیں

ہر گام پر لاکھوں نگیں

اے گولکنڈے کے جہاں　　اے لال قلعے کی زمیں

اے دولتوں کے آسماں　　اُونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

رنگِ اجنتا تجھ میں ہے حُسنِ ایلورا تجھ میں ہے
شانِ مدورا تجھ میں ہے

رامیشورم کی سرزمیں سانچی کی دنیا تجھ میں ہے
فن و ہنر کے آسماں اُونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

جنّت کی اک تصویر ہے یا تاج کی تعمیر ہے
اک موجۂ تنویر ہے
کس بادشاہِ فکر کے خوابوں کی یہ تعبیر ہے
حُسنِ تخیّل کے جہاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

بابر کی شوکت کے نشاں حیدر کی سطوت کے نشاں
ٹیپو کی صولت کے نشاں
ملتے ہیں تیری خاک پر اکبر کی عظمت کے نشاں
اے عظمتوں کی داستاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

تو اہلِ دل، اہلِ بصر تو ناقدِ ذوقِ نظر
تو نکتہ بیں، تو دیدہ ور
تو ہے اہنسا کا امیں تو امن کا پیغامبر
اے حاملِ امن واماں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ٹیگور تیرا ہم زباں اقبال تیرا رازداں
قاضی ہے تیرا نغمہ خواں
اور بلبلِ رنگیں نوا آزاد تیرا ترجماں
اے شعر و نغمہ کے جہاں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

جو دَور بھی آتا رہے تجھ سے ضیاء پاتا رہے
تو اُس کو چمکاتا رہے
تو دُور بھی نزدیک بھی انوار برساتا رہے
انوار کے اے رازداں اُونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ایسا ترا اقبال ہو جور و جفا پامال ہو

سارا جہاں خوش حال ہو

اور پھر ترا روئے حسیں مارے خوشی کے لال ہو

اے خطۂ راحت رساں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

ماضی ترا اے خوش گہر مہتاب سے تابندہ تر

اٹھ اور جما اپنی نظر

اس الجھنوں کے دور میں آئینۂ امروز پر

اے باعثِ آرامِ جاں اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں